حصہ سوم

○ مقالہ نگاران :

ڈاکٹر عابد احمد علی
مفتی اعجاز ولی رضوی
بشیر احمد صدیقی

○ ترتیب و حواشی :

قاضی عبدالنبی کوکب

رضا اکیڈمی — دائرۃ المصنفین ۸۔ اردو بازار۔ لاہور

مندرجات

صفحہ

طبع اوّل — ۱۱ اپریل ۱۹۷۱ء

طابع و ناشر — حکیم قاضی عبد المجتبیٰ ارشد

تعداد — ایک ہزار

کتابت — ادارہ پروینِ کتابت لاہور

مطبع — کنول آرٹ پریس انارکلی لاہور

ھدیہ — ایک روپیہ بیس پیسے

ملنے کا پتہ : رضا اکیڈیمی ۔ دائرۃ المصنفین (مبارک سنز سٹیشنرز) ۸۔ اردو بازار لاہور

ڈاکٹر عابد احمد علی ایم۔اے (علیگ) ڈی۔فل (آکسفورڈ)
مہتمم بیت القرآن۔ پنجاب پبلک لائبریری۔ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محدثِ بریلوی اور سید محمد سلیمان اشرف

نحمدہٗ ونصلی علیٰ حبیبہ الکریم۔ ونعوذ باللہ من شرورِ انفسنا ومِن سیّاٰتِ اعمالنا من یھدہ اللہ فلامضل لہٗ ومن یضللہ فلاھادی لہ ونشھدان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھدانّ سیدنا ومولانا محمداً عبدہٗ ورسولہٗ
ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب○

صدرِ محترم، عزیزانِ گرامی قدر اور واجب الاحترام علماء

آج ہم پاک و ہند کی ایک بہت بڑی دینی شخصیت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پچاسویں یوم وصال کی تقریب میں جمع ہوئے ہیں۔ میرے حافظے میں حضرت مولانا کے بارے میں کچھ قیمتی تاثرات محفوظ ہیں۔ جن میں کچھ تاثرات براہ راست بطور مشاہدہ مجھے بچپن کے زمانے میں حاصل ہوئے اور کچھ تاثرات اپنے دور طالبعلمی میں ڈاکٹر اقبال مرحوم اور مولانا شاہ سلیمان اشرف مرحوم کی وساطت سے مجھے حاصل ہوئے۔ میرے فاضل عزیز قاضی عبدالنبی کوکب صاحب مجھے باصرار کہتے رہے کہ آپ یہ علمی امانت قلم بند کر دیں اور اسے دوسروں تک پہنچا دیں تاکہ تاریخ و تذکرہ کی

دنیا میں اس کی حفاظت ہو سکے۔ چنانچہ آج اسی مشورے پر عمل کرتے ہوئے یہ چند سطور پیش خدمت کر رہا ہوں

ع فالدرّ یزداد حسناً وھو منتظم

[موتیوں کو جب پرو دیا جائے تو ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے]

صاحب عرس کے بارے میں میرے براہ راست تاثرات، اس دور کے ہیں جب میرے والد ماجد سیّد احمد علی مرحوم، بریلی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ میری عمر اُس وقت تقریباً نو برس کی تھی۔ والد مرحوم بسلسلہ ملازمت کوئی اڑھائی سال کے لگ بھگ بریلی میں مقیم رہے۔ اس دوران میں والد نماز جمعہ کی ادائیگی کیلئے ہمیشہ بریلی کی جامع مسجد نومحلہ میں تشریف لے جاتے اور میں بھی اکثر آپ کے ساتھ ہوتا۔ اکثر و بیشتر ہمیں دوسری تیسری صف میں بیٹھنے کا موقع مل جاتا۔ اسی مسجد میں حضرت مولانا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ خطبۂ جمعہ ارشاد فرمایا کرتے۔ منبر پر ان کے بیٹھنے اور ان کے حلیہ مبارک کا منظر ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ حضرت والا، بلند قامت خوبرو اور سرخ و سفید رنگ کے مالک تھے۔ ڈاڑھی اُس وقت سفید ہو چکی تھی مگر نہایت خوبصورت تھی، آواز زحد شیریں اور گداز تھی۔ آپ کا وعظ نہایت موثر ہوتا تھا۔ میں اگرچہ بچہ تھا مگر اس کے باوجود آپ کے مواعظ میں میرے لئے کوئی کشش ضرور تھی۔ اکثر مجھ پر انہماک سا طاری ہو جاتا اور حاضرین کی کیفیت تو اس سے بڑھ کر ہوتی تھی مجھے یہ بھی محسوس ہوتا کہ طبیعت کے اعتبار سے آپ کا وعظ خاصا مفصل اور طویل ہوتا ہوگا مگر وہاں خطبۂ جمعہ حاضرین کی سہولت کیلئے اکثر مختصر فرما دیتے۔ کچھ آپ کا اس طرح کا فقرہ بھی میرے حافظے میں رہ گیا ہے۔ فرماتے: "میری آواز میں خستگی ہے مگر میں آپ لوگوں کے خیال سے کلام کو لمبا نہیں کرتا۔"

وعظ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے، آپ حکایاتِ ماثورہ بھی بیان فرماتے مگر آپ کے

مواعظ کی اصل بنیاد آیات اور احادیث پر قائم ہوتی تھی۔ اب میرے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے، کاش اس دور میں آپ کے مواعظ حسنہ کو محفوظ کر لیا جاتا تو یہ ہمارے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہوتا۔

مولانا مرحوم کے بارے میں میرے بالواسطہ تاثرات کا ایک وقیع اور قیمتی حصہ وہ ہے جو مجھے اپنے استاذ محترم مولانا سید سلیمان اشرف کی وساطت سے حاصل ہوا۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں مجھے برسوں ان کی مربیانہ صحبت میں رہنے کا شرف حاصل رہا۔ وہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی شخصیت سے از حد متاثر تھے۔ اسی دور کی دو اور شخصیتوں کو ساتھ ملا کر سید صاحب فرمایا کرتے "ان تین ہستیوں کو دیکھ لینا چاہیئے پھر ایسے لوگ نہیں ملیں گے۔"

استاذ محترم مولانا سید سلیمان اشرف پر حضرت مولانا بریلوی کا اتنا اثر تھا کہ میں نے مولانا احمد رضا خاں قدس سرہٗ کی عظیم شخصیت کا اندازہ دراصل استاذ محترم کی شخصیت ہی سے لگایا۔ مجھے مولانا سلیمان اشرف سے شرف تلمذ کے علاوہ ان کا انتہائی قرب بھی حاصل رہا۔ اور میں دیکھتا کہ وہ اکثر حضرت مولانا بریلوی کا ذکر خیر چھیڑ دیتے اور یوں محسوس ہوتا کہ اکثر انہی کے تصور میں مگن رہتے حتیٰ کہ استاذ محترم کی طبیعت انہی کے رنگ میں رنگی گئی تھی۔ وہ اپنے معتقدات اور ایمانیات میں منطقی استدلال اور علوم عقلیہ میں خوش کلامی اور قوت بیان میں، حضرت مولانا کے انداز اور کیفیات کو اپنا چکے تھے۔ غیر اسلامی شعائر کی مذمت میں تشدد، کانگریس اور ہندوؤں کی ہم نوائی کرنے والے لیڈروں اور عالموں کے متعلق سخت گیر رویہ، مشرکین کو نجس سمجھنا اور ان کے معاملے میں کسی قسم کی مداہنت روا نہ رکھنا، یہ سب صفات، دونوں بزرگوں میں مشترک تھیں۔ اسی طرح عشق رسول ؐ کے معاملے میں طبیعت کا ایک والہانہ انداز بھی سید صاحب میں حضرت فاضل بریلوی ہی کی طرف سے آیا تھا۔ لباس اور وضع قطع

میں بھی استاذ محترم حضرت مولانا کا تتبع فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ مجھے یاد ہے کہ آپ عمامہ بھی اسی انداز کا رکھتے، جیسا کہ حضرت مولانا مرحوم استعمال فرماتے تھے۔

کانگریس اور گاندھی کے خلاف شدید مذمت اور بیزاری کا رویہ جس طرح حضرت مولانا بریلوی نے اختیار کیا تھا بعینہٖ وہی چیز سید صاحب میں بھی پائی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ علیگڑھ یونیورسٹی کی مسجد میں بعض لوگوں نے گاندھی کو تقریر کے لئے بلایا۔ تو سید صاحب نے بعد میں خود اپنے ہاتھ سے ساری مسجد کو دھو کر صاف کیا اور اس سلسلے میں سید صاحب کے فکری جہاد کا اندازہ کرنے کے لئے آپ کی تالیفات "النور" اور "المبین" وغیرہ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی اس موضوع پر حضرت مولانا احمد رضا خاں کی تالیف المحجۃ المؤتمنۃ" بھی پیش نظر رہے۔

بالواسطہ تاثرات کا بقیہ حصہ وہ ہے جس کا تعلق حضرت علامہ اقبال مرحوم سے ہے علیگڈھ میں سید راس مسعود کے بلانے پر اقبال اکثر جایا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک کا زمانہ وہ ہے جس میں اقبال تقریباً ہر سال علیگڈھ گئے ہوں گے۔ اس عرصے میں ایک بار استاذ محترم مولانا سلیمان اشرف نے اقبال کو کھانے پر مدعو کیا اور وہاں محفل میں حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا ذکر چھڑ گیا۔ اقبال نے مولانا کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی کہ وہ بے حد ذہین اور باریک بین عالم دین تھے۔ فقہی بصیرت میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ ان کے فتاویٰ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر اعلیٰ اجتہادی صلاحیتوں سے بہرہ ور اور پاک و ہند کے کیسے نابغۂ روزگار فقیہہ تھے۔ ہندوستان کے اس دور متاخرین میں ان جیسا طباع اور ذہین فقیہہ بمشکل ملے گا۔ اس کے ساتھ ہی اقبال مرحوم نے مولانا کی طبیعت کی شدت اور بعض علماء کے بارے میں ان کی طرف منسوب سخت گیر رویے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر یہ الجھن درمیان میں نہ آپڑتی تو ان کا وقت اور علم و فضل، ملت کے دیگر مسائل کے لئے زیادہ مفید طریقے سے صرف ہوتا اور یقیناً"

وہ اس دور کے ابو حنیفہ کہلا سکتے تھے [1]

یہ وہ رائے تھی جو اقبال مرحوم حضرت مولانا قدس سرہٗ کے بارے میں رکھتے تھے۔ مجھے مولانا کی سخت گیر روش کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ یہ اُس دور میں امتِ اسلامیہ کی ایک بہت بڑی خدمت تھی ۔علماء کا ایک گروہ گاندھی کی تحریکِ قومیت کا جس انداز میں ساتھ دے رہا تھا اگر اس کا مقابلہ بروقت پوری شدت کے ساتھ نہ کیا جاتا تو کسے معلوم کہ ہماری تحریک آزادی کا آج کیا حشر ہو چکا ہوتا ؟ مجھے اس دور کی صورت احوال کا اچھی طرح سے اندازہ ہے اور استاذ محترم مولانا سید سلیمان اشرف کی بے تابیاں بھی میرے ذہن پر نقش ہیں۔ خدا کو منظور ہوا تو شاید کسی دوسرے موقع پر کچھ مزید مفصل باتیں عرض کر سکوں۔

میرا آخری تاثر اس سلسلے میں یہ ہے کہ میں علماء کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہوں ایک وہ جو محض اپنی محنت سے رتبہ کمال پر پہنچتے ہیں اور دوسرے وہ جو فطری طور پر غیر معمولی ذہین اور طباع ہوتے ہیں۔ جنہیں انگریزی میں (GENIUS) کہا جاتا

---

[1] محترم ڈاکٹر عابد احمد علی صاحب کے ذریعے سے علامہ اقبال مرحوم کے یہ تاثرات پنجاب یونیورسٹی میں لکھے گئے ایک مقالے میں بھی نقل کئے گئے ہیں۔ اعلیٰحضرت پر یہ مقالہ جناب محمد صدیق اکبر نے ایم۔ اے اسلامیات ۱۹۶۹ء کے لئے لکھا تھا۔ مقالہ مذکورہ میں یہ تاثرات قدرے مختلف الفاظ میں درج ہیں مگر مفہوم میں کوئی بنیادی فرق نہیں البتہ اس میں علامہ مرحوم کے حسب ذیل الفاظ مزید ہیں۔ "مولانا (یعنی اعلیٰحضرت قدس سرہٗ) ایک دفعہ جو رائے قائم کر لیتے تھے اس پر مضبوطی سے قائم رہتے تھے۔ یقیناً وہ اپنی رائے کا اظہار بہت غور و فکر کے بعد کرتے تھے لہٰذا انہیں شرعی فیصلوں اور فتاویٰ میں کبھی کسی تبدیلی یا رجوع کی ضرورت نہیں پڑی"۔ دیکھئے مقالہ مذکورہ ص ۵۔ (کوکب)

ہے۔ میرے نزدیک حضرت مولانا احمد رضا کا شمار اس دوسرے گروہ میں ہوگا۔ اس کے بعد توفیق خداوندی نے ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دینی وملی خدمات کے راستے پر ڈال کر انہیں عظیم تر بنا دیا۔ یقیناً مولانا برصغیر ہند و پاک کی اُن ممتاز شخصیتوں میں ہیں جنہوں نے اپنے علم و فضل، غیر معمولی صلاحیتوں اور پھر اپنی مسلسل تبلیغی جد وجہد سے اس برصغیر کے مسلمانوں کے دینی و تہذیبی شعور کو بیدار کیا اور عملی طور پر انہیں جذبۂ اسلامی سے سرشار کر دیا۔

ہر نامور شخص کے کارناموں کی قدر و قیمت جانچنے کے لئے دو چیزوں کا پیشِ نظر ہونا ضروری ہے۔ اول یہ کہ اس زمانے کے ماحول کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے۔ دوم یہ غور کیا جائے کہ اگر بالفرض وہ بزرگ ہستی اس دور میں معرضِ وجود میں نہ آتی تو اس خلا کو کون پُر کرتا اور اگر یہ خلا پُر نہ ہو سکتا تو دینی و قومی اعتبار سے اس کے کیا خطرناک نتائج پیدا ہوتے۔ ان معیاروں کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھیں تو مولانا کی جامع شخصیت وقت کی پکار کا صحیح جواب تھی اور اس دَور کے جو دینی و ملی تقاضے تھے ان کو پورا کرنے میں آپ نے بے مثل کردار ادا کیا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا بریلویؒ عشقِ رسول کے جذبے سے اس حد تک سرشار تھے کہ اس کے سامنے وہ ہر چیز کو ہیچ سمجھتے تھے اور میرا یہ تاثر اس لئے ہے کہ میں نے اپنے استاذ مولانا سلیمان اشرف کو بھی اسی رنگ میں رنگا ہوا پایا جو کہ مولانا بریلوی کے خلفاء میں تھے اپنے بزرگوں کی شخصیت میں عشقِ رسولؐ کا یہ والہانہ جذبہ ہمارے لئے ایک دعوتِ فکر ہے۔ میں اس پہلو پر بہت غور کرتا رہا ہوں اور آخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہر چیز کا ایک IRREDUCABLE MINIMUM ہوتا ہے اور اسلام میں اس نوعیت کا معیار دو چیزوں پر مبنی ہے۔ (۱) عقیدۂ توحید و محبتِ الٰہی (۲) ایمان بالرسالۃ، عشقِ رسولؐ۔ اس کے بعد اب یہ غور کریں کہ آج ہم میں سے کون

ہے جوان معیاروں میں مولانا احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ کے پاسنگ بھی ہو سکتا ہو۔

بقاءِ ملت کے لئے نہایت ضروری ہوتا ہے کہ اس کا ملی شعور شدت ہی کے ساتھ نہیں بلکہ ایک گونہ تعصب کی حد تک بیدار اور مستحکم رکھا جائے تاکہ ملت کی انفرادی حیثیت منفرد اور قائم رہے۔ جس دور میں مولانا بریلوی موجود تھے اس کا سب سے بڑا تقاضا بھی تھا اور مولانا مرحوم و مغفور نے اس مقصد کے لئے نہایت پامردی کے ساتھ کام کیا۔ ورنہ ہمارے بڑے بڑے علماء کے قدم اس وقت ڈگمگا گئے تھے۔ مولانا نے دراصل ملی شعور کی تازگی اور بقا کے لئے ایک تحریک پیدا کر دی تھی۔ ان کی یہ تحریک بعد میں بھی جاری رہی۔ جس میں استاذ محترم مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم نے بھی بہت کام کیا جس کا میں ذاتی طور پر گواہ ہوں۔ یقیناً آپ کے دیگر خلفاء بھی اس تحریک کے سرگرم رکن ہوں گے۔

(تمت بالخیر)